

مولانا الطاف الرحمان بنوری

بابل کا نمرود

نمرود کی نسبی، حسبی اور تاریخی حیثیت کا جائزہ

آج سے ہزاروں سال پہلے بابل (موجودہ عراق) دنیا کی اس عظیم الشان سلطنت کا پایہ تخت تھا جس کی سطوت و شوکت کی ہر طرف دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ نظم ملکوت کی بھاگ ڈور ستارہ سخ انسانی کے انتہائی متکبر و جبار۔۔۔ نمرود نامی ایک ایسی شخصیت کے ہاتھوں ہی تھی جس نے اس وقت کے بابلی مذہب — کوکب پرستی کے سب سے بڑے الہ — آفتاب — کی مندریت اور زمینی نیابت کے پورے میں خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور رعیت کو اپنے مرمومہ آستانہ جلال پر سجدہ کرنے کا حکم مورخین بالعموم چار آدمیوں کو "ملوک الدنیا" کے نام سے یاد کرتے ہیں جن میں نمرود سرفہرست ہے۔ نمرود کون تھا؟ اس سوال کے جواب میں متعدد اقوال منقول ہیں۔ کسی نے اس کو نمرود بن فاح بن عامر بن صالح بن ارفخشذ بن سام بن نوح علیہ السلام بتایا ہے۔ اس کے علاوہ نمرود تا نوح علیہ السلام کے نسبی عمود کو اور بھی کئی طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ قرون اولیٰ کی کسی بھی شخصیت کا واقعہ کے زمانے کی صحیح اور قطعی تعیین دشوار ہی نہیں بلکہ قریباً قریباً ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں توریت، تاریخ یا آثار قدیمہ کے مطالعہ سے جو بھی نتیجہ اخذ کیا جاتے۔ وہ کسی طور بھی حریف آخذ کہلاتے جلنے کا مستحق نہیں۔ موجودہ توریت سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ خدا تعالیٰ کی کتاب نہیں بلکہ اسرائیلی زائفین و محرفین کا مرتب کردہ وہ مشتبہ مجموعہ ہے جس میں خدائی مقنن اور انسانی مخرج کا کوئی امتیاز نہیں بے شمار نقلی اور خارجی شواہد کے علاوہ اس کی عبادات اور مندرجات ہی میں بیسیوں وہ عقلی اور داخلی قرائن موجود ہیں۔ جو نہ صرف اس کی لاهوتی حیثیت کو چیلنج کرتی ہیں۔ بلکہ ساتھ ساتھ اس حقیقت کی غمازی بھی کرتی ہیں۔ کہ وہ کوئی یقین آفرین صحیفہ آسمانی نہیں بلکہ پایہ اعتبار سے ساقط ظن و تخمین کا پلندہ ہے۔

توریت کے بعد ان تاریخی دفاتر کا نمبر آتا ہے جن کا ماخذ توریت ہی یا اس سے بھی زیادہ غیر مستند وہ زبانی روایات ہوتی ہیں جو سا لہا سال تک ان غیر ذمہ دار لوگوں کی قصہ گوئیوں اور داستان سراییوں کا حصہ رہ چکی ہوتی ہیں

جو نقل حکایت میں کسی قسم کا احتیاط برتنے کی کوئی پابندی محسوس نہیں کرتے۔ اندریں حالات صحیح سے صحیح تر واقعہ بھی اس تاریک دور سے سلامتی کے ساتھ گزرانے کی کوئی ضمانت فراہم نہیں کرتا۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں ماضی کے درپہلوں میں جھانکنے اور تاریخی تحقیقات کے لئے آثار قدیمہ کے فنی جائزوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بلاشبہ یہ طرز تحقیق انسانی علوم میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ نیز کسی واقعہ کے نفس وجود و عدم کی بہت اس کا فیصلہ غلبہ غالب پیدا کرنے میں مفید بھی۔ لیکن اوقات و ازمائش کی تعیین میں اس کی راہنمائی پر کوئی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مانا کہ انسانی کاوشوں نے بہت سے مستبعدات عقلمند کو روزمرہ کے عمومی معمولات کی صفت میں لاکھڑا کیا ہے۔ اور متحیر العقول کا زمانہ سرانجام دے رہے ہیں لیکن اجسام طبعیہ کو متاثر کرنے والے لامتناہی عوامل اور ان کی اثر اندازی کی ٹھیک ٹھیک رفتار و مقدار معلوم کرنے کے لئے تاہنوز کوئی ایسا معمل تیار نہیں ہو سکا ہے جو یقین تو کیا اس سے کم درجہ سطر معتد بہ اطمینان پیدا کر سکے۔

لا تعداد تفصیلی امثلہ کو چھوڑیے۔ مذکورہ بالا بیان کی توثیق کے لئے ایک ہی مثال پیش خدمت ہے جس سے ناواقف قارئین کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کے زمانہ پیدائش کی تعیین میں توریت اور اکثر کتب تواریخ یک زبان نہیں۔ تاہم ان کے الگ الگ بیانات میں ناقابل تطبیق اختلافات کے باوجود یہ قدر مشترک فرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ بضع الوقت (تین سے نو ہزار سال پہلے) کا واقعہ ہے لیکن تاریخ ہی کی بعض دوسری کتابوں یا آثار کہتے ہیں کہ یہ شہادت اس کو اس سے بہت ہی پہلے کا واقعہ قرار دیتی ہے۔

علامہ عبد الوہاب شعرانی اپنی کتاب "البرہان فی تاریخ العرب" میں شیخ ابن العربی مالکی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بعض قدیم تاریخوں میں مذکور ہے کہ اہرام مصر کی تعمیر اس وقت ہوئی جب کہ "نسر" برج اس دور ایک نئے کے مطابق برج حمل میں تھا جب کہ ابھی جدی میں ہے۔ شیخ عبد الکیم شیخ اکبر کے اس کلام کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ بات معلوم ہے کہ "نسر" کسی ایک برج سے دوسرے برج کی طرف تیس ہزار سال میں منتقل ہوتا ہے۔ علامہ جبلی کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں دلوں میں ہے۔ اس حساب سے "نسر" تعمیر ہرام سے لے کر اب تک دس برج قطع کئے ہیں جس میں کوئی تین لاکھ سال صرف ہوئے ہیں۔

اہرام مصر آج بھی فن تعمیر کا شاہکار نمونہ تصور کیے جاتے ہیں۔ اور دنیا کے عجائبات میں محسوب ہیں۔ ان کی تعمیر انسانی دور اولین میں نہیں بلکہ یقیناً اسی وقت ہوئی ہوگی جب کہ اس نے تہذیب و تمدن اور تعمیر و ترقی کے سینکڑوں مراحل طے کئے ہوں گے۔ تین لاکھ سال میں ان ارتقائی مراحل میں صرف ہونے والی تخمینی مدت کا اضافہ کیجئے یہی آغاز انسانیت — پیدائش آدم علیہ السلام — کا زمانہ قرار پائے گا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ کہ
 "ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ ضحاک بن علوان ہی نرود تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی کے زمانے
 میں پیدا ہوئے اور یہی تھا جس نے اُس کے جلانے کا قصد کیا تھا۔"
 لیکن ابن اثیر نے اس قول کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نرود بنطی نسب اور ضحاک فارسی النسل
 ہیں پھر دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔

ابن اثیر "الکامل" میں نرود کو مستقل حکمران نہیں بلکہ ضحاک بن علوان کا عامل بتلاتا ہے۔ لیکن قرآنی اثر
 "ان ائمة السلاسل" میں لفظ "الملک" اور اس کا انداز استعمال ان کی اس رائے کی کھلی تغلیط کرتا
 ہے۔ قرآن مجید کی تصریح ہے کہ اس نے ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم السلام کے ساتھ خدا تعالیٰ کی
 ذات و وجود میں محض اس بنا پر مناظرہ کیا کہ رب تعالیٰ نے اس کو قدرت و حکومت عطا کی تھی۔ معدوم ہوتا
 ہے کہ وہ اقتدار و اختیار کے اس بلند مقام پر فائز تھا جس کے ہوتے ہوئے اس کو کسی دوسرے کی برائی
 کا۔ اقرار تو کیا۔ احساس تک نہیں تھا۔ اصل بادشاہ اور صاحب اقتدار و اختیار کوئی اور ہوتا تو عالم
 کی طرف سے "اَنَا اُحْيِي وَ اُمِيتُ" جیسی مطلق العنانی اور غیر معلق و مشروط تصرف کا دعویٰ بعید از قیاس ہے
 "ملوک الدنیا" کے نقب سے معرف ان چار حکمرانوں یعنی نرود۔ ذوالقرنین۔ بخت نصر اور حضرت سلیمان
 علیہ السلام میں سے اول الذکر کی بابت زیادہ سے زیادہ۔ کہ اس کا زمانہ سب سے قدیم تر ہے۔ اور آخر الذکر کے
 بارے میں کم سے کم۔ کہ اس کو تسخیر کائنات کی غیر معمولی قوتیں حاصل تھیں۔ یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ ارمنہ

بیقہ ابن العربی کی غولہ تاریخ نے بنائے ابرام اور "نسر" کے اسد باطل میں ہونے کا یہ تعلق کہاں سے معلوم کیا
 اس میں عقلی احتمالات تو بے شمار ہو سکتے ہیں تاہم اصولی طور پر ان کی تحدید یوں ممکن ہے۔ کہ یا تو ابرام کی براہ راست اپنی
 تاریخ محفوظ ہو یا کسی غیر مسلسل منقطع سلسلہ نقل سے ماخوذ یا اثرات سے مستفاد ہو۔ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کیے
 ہیں کہ پہلی صورت غیر واقع ہے۔ لہذا دوسری یا تیسری صورت متعین ہے۔ اب تخلیق آدم علیہ السلام کے زمانہ کی تعیین میں
 توریت اور اس کے قریب الخیال تواریخ و آثار کی بات مان لی جائے۔ یا قریب قریب اسی پایہ کی دوسری تاریخوں اور جدید ترین
 اثرات جو عمرانیات کی مدد سے انسانی تاریخ کی کہنگی کا پتہ چلاتی ہیں پر مبہروسہ کیا جائے اور جو بھی صورت اختیار کی جائے
 اس کی کوئی معقول وجہ ترجیح کیا ہوگی۔ نرود می دور حکومت اور اس کے زمانہ عروج کی تعیین میں نینوں علمی ذرائع —
 توریت اور تواریخ و اثرات — متفق الخیال نہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے کسی متعین عدد کی بجائے "ہزاروں سال" کا
 مہم انداز اختیار کیا جو عرفاً قدامت کے ہر درجہ کے لئے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔

ماضیہ کے اُن قدیم ادوار میں جب کہ انسانیت — فی الوقت بڑی عمرہ اور ترقی یافتہ ہی تھی — نسبتاً ایک نہایت ہی تنگ و تاریک تمدن سے گزر رہی تھی۔ کیا عقلی طور پر یہ ممکن بھی ہے کہ ساری دنیا ایک وحدت میں سموئی ہوئی ہو جس کا مرکز دوسرے تمام اعضاء سے مملکت پر پوری طرح حاوی اور مسلط ہو۔ ایک ایسے زلزلے میں جب کہ گھوڑوں، گدھوں اور اونٹوں کے سوا مواصلات اور نقل و حمل کا کوئی انتظام نہ تھا۔ غرود مذہبی پیشوائی اور سیاسی فرماں روائی دونوں کا جامع تھا۔ اس دوسری حیثیت سے جہاں اس کی ذمہ داریاں اس حد تک بڑھتی ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے اس وقت کے مروجہ وسائل قطعاً ناکافی تھے۔ وہاں اس کی ذات کی اس بے سرو سامانی کے باوجود یہ ہمہ جہتی مرکزیت اس خدشے کو بھی جنم دیتی ہے کہ چار دانگ عالم کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی دور دراز کی ساری آبادیاں — انسان کے فطری جذبہ آزادی و حریت کے باوصف اس کے جابرانہ کنٹرول میں کیونکر ایسی جکڑی ہوئی تھیں کہ اس کے دور حکومت کے طول طویل زمانے میں کسی کو بھی اس مغرور مقتدر سے سربازی کی جرأت نہ ہوئی۔

یہی وہ عقلی پیچیدگی اور الجھن ہے جس کی وجہ سے ملوک دنیا کی اس تاریخی روایت کو حقیقت کی بجائے ایک مفروضہ سمجھا جا رہا ہے۔ اور بلاشبہ اپنے ظاہری معنی میں مفروضہ ہی ہے تاہم اس کی تصحیح کی کوششوں میں کئی توجہات کی گئی ہیں۔ مثلاً پہلی توجہ یہ وہ کہ جس میں عمرانیات کی مدد سے لفظ دنیا کو — اس وسیع مفہوم میں جو آج کل اصطلاح میں متبادر ہے کاٹ کر — ایک ایسے معنی پر حمل کیا گیا ہے جس سے یہ استبعاد خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ابھی ہی طوفان نوح علیہ السلام کی ہولناکیاں تمام انسانی بستیوں کو نابود کر چکی تھیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ہمراہ کشتی میں سوار بمشکل کئی نفوس زندہ بچ رہے تھے جو یقیناً ایک لمبے عرصے تک عذاب کی دہشت اور ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات میں تنہائی کی وحشت سے بھجوداؤں سر اسیمہ ہوتے ہوں گے۔ نسل انسانی کا باقاعدہ تسلسل جاری ہو جانے میں خدا معلوم کتنا عرصہ لگ ہو چکا ہو گا اور پھر اس کی شرح افزائش کیا ہوگی۔ ابن خلدون نے کتاب البدلہ کے حوالے سے غرود کو نوح علیہ السلام کے بعد پانچویں پشت میں قرار دیا ہے۔ اس مختصر سی مدت میں نسل انسانی اور اس کی آبادیاں جس کی حد تک بڑھنے اور پھیلنے کا امکان ہے اسی کا تصور غرود کے ”ملک الدنیا“ ہونے کا ایک قابل قبول نقشہ متعین کرتا ہے۔

یہ توجہ یہ بظاہر اشکال کو حل کرتی نظر آتی ہے لیکن دوسرے بے خدوش قرار پاتی ہے۔ اولاً یہ کہ اس میں غرود ہی کی عالمی حکمرانی کو ممکن الوقوع بنانے کے لئے تقلیل و تفضیق معورہ کی جو سعی کی گئی ہے وہ جیسی کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب کہ طوفان نوح علیہ السلام کو عام مان لیا جائے۔ حالانکہ اس کی عمومیت

مشکوٰۃ اور غیر قطعی ہے۔ ثانیاً یہ کہ جن تاریخوں نے مفرد کو ملک الدنیا ہونے کا اعتراف بخشا ہے انہیں کی بعض دوسری روایات اسی کے ہم عصر کئی ایسے دوسرے باوشتا ہوں کا پتہ بھی دیتی ہیں جن کے اس کے زیر اقتدار اور تحت احکم ہونے کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں۔

مفرد کے ملک الدنیا ہونے کی دوسری اور بالکل بے غبار توجہ یہ یوں ممکن ہے کہ اگرچہ دنیا کے مختلف خطوں اور نسلوں میں اس کی معاصر اور بھی حکومتیں موجود تھیں جو اس کی باجگذار نہیں بلکہ آزاد و خود مختار تھیں لیکن وہ سب بال کی مضبوط، محکم اور منظم مفردی حکومت کے مقابلے میں پیچ اور کالعدم تھیں۔ گویا کہ اقوامی میں منحصر مانا گیا۔

غرض کی بھی طور ملک الدنیا کا اطلاق مجاز سے خالی نہیں۔ پہلی توجہ یہ لفظ "دنیا" اور دوسری لفظ "ملک" میں تصرف پر مبنی ہے۔

ہر حال سبب اور تاریخی لحاظ سے مفرد کوئی اور کچھ بھی تھا۔ جسبی لحاظ سے فساد آدمیت کا بدترین نمونہ پیش کرنا تھا وہ حدود عبودیت سے نکل نکل کر عبودیت کے حدود میں دخل اندازیاں کر رہا تھا۔ اور کسی کی حکومت کی بجائے ہر ملک اپنی حاکمیت مطلقہ کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔ لہٰذا وسائل کی ہمتاں، اسباب تعیش کی فراوانی اور عسکری قہر و قوت کی برتری نے اس کی حیوانی غصلتوں میں اشتغال و انگیخت پیدا کر دیا تھا جس کی تیش و حرارت نے اس کے فہم و شعور اور تمام انسانی ملکات کو مجسم کر ڈالا تھا۔

ولیسٹاپیر سواریا

کامریٹر و اچ مینی



لکشمی بلڈنگ ایمر۔ اے جناح روڈ۔ کراچی فون: ۲۳۱۱۱۹

۱۔ ابن عربی کی تسلی و تشفی کے لئے واضح ہو کہ اس توجہ میں لفظ دنیا کا سمجھنا "رعایت معنی عندا شکام" کے مطابق ہے۔ نہیں تو حالت اعتبار احکم کے لحاظ سے حقیقت بنے گی۔ علاوہ ازیں اس لفظ میں اس مجاز سے پہلے ایک اور نچر بھی موجود ہے جو کثرت وقوع کی وجہ سے حقیقت کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ فنون ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین خود ہی سوچ لیں۔